یکم اگست ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۹

اس شمارے میں

▲

آل احمد سرور

اردو دنیا

جدّت پرستی اور جدیدیت

ترقی اردو بورڈ یوں تو یونی ورسٹی کی پہلی منزل کی کتابیں تیار کرنے کے لئے قائم کیا ہے، مگر اس کے پہلے صدر ڈاکٹر راؤ نے بچوں کے لئے ادب تیار کرنے اور سائنس کے متعلق عام فہم کتابیں لکھوانے کے کام کو بھی ضروری قرار دیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے کی کتابیں بھی تیار کرائی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر راؤ نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستانیوں کو جدید ذہن اور عالمی میلانات سے آشنا کرانا بھی ضروری ہے اور اردو میں بھی ایسی کتابیں لکھوانے کی بھی ضرورت ہے جو اس مقصد کو پورا کریں۔ بورڈ نے کتابوں کے عنوان تجویز کرنے کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جس میں اس پر بحث شروع ہوگئی کہ (MODERNISM) کیا ہے۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ سائنس، سماجی علوم اور انسانی علوم کے چند ماہرین کا ایک چھوٹا سا سیمنار کیا جائے جس میں ان علوم میں جدید میلانات پر غور کرکے یہ طے کیا جاسکے کہ کس قسم کی کتابیں لکھوانے سے بورڈ کا مقصد پورا ہوسکے گا۔ یہ سیمنار ۲۳، ۲۴ر جولائی کو جامعہ ملیّہ دہلی میں ہوا۔

سیمنار کا افتتاح پروفیسر مجیب کی تقریر سے ہوا جس میں انھوں نے کہا کہ ہمارا مقصد صرف (MODERNISM) کی اصطلاح پر بحث کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ طے کرنا ہے کہ اردو دنیا کے لئے کس قسم کی کتابیں لکھوانی چاہئیں۔ اس کے بعد حسب ذیل حضرات نے اپنے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ سید عبدالرحمٰن نے پڑھا۔

(۱) آل احمد سرور۔	جدّت پرستی، جدیدیت اور ان کے مضمرات۔
(۲) سید عبدالرحمٰن۔	سائنس۔ سماج اور ماڈرنزم
(۳) مسز سلطانہ آینگر۔	ماڈرنزم کا مفہوم اور اس کے مضمرات۔
(۴) ڈاکٹر منوہر لال۔	(MASS MEDIA) عوامی نشریات اور ماڈرنزم۔
(۵) آئی۔ پی۔ تیواری۔	ماڈرن اور ماڈرنزم۔
(۶) ڈاکٹر وی۔ پوری۔	حیاتیات میں ماڈرنزم۔
(۷) ڈاکٹر وحید ملک۔	علم کیمیا میں ماڈرنزم۔
(۸) سید محمد تونکی۔	تعلیم میں ماڈرنزم۔
(۹) ظفر اقبال اور جی۔ پی۔ تلوار۔	علم حیاتیات میں جدیدیت۔
(۱۰) رمیش چندر۔	ٹیلی وژن اور ماڈرنزم۔

مقالات پر بحث میں ڈاکٹر اے۔ ایم۔ خسرو، ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی اور دوسرے حضرات نے بھی حصّہ لیا بحث کے بعد اس بات پر سبھی متفق تھے کہ (MODERNISM)

یا جدت پرستی سے بچنا چاہیے لیکن (MODERNITY) یعنی جدیدیت کو اپنانا چاہیے تاکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید ترین اکتشافات انسانیت کے لئے باعث خیر ہوں نہ کہ باعث شر۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ جدیدیت محض جدید مشینوں کی ایجاد ٹیلی وژن اور بقول اقبال مشینوں کی حکومت کا نام نہیں بلکہ فرد کی آزادی، سماج سے اس کے صحت مند رشتے اور تنقیدی نظر کا نام ہے۔

سیمینار نے سفارش کی کہ حسب ذیل عنوانات پر کتابیں لکھوائی جائیں۔ ہر کتاب لگ بھگ سو صفحے کی ہو۔ چند بنیادی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو سکتا ہے مگر زیادہ زور ماہرین سے کتابیں لکھوانے پر رہے۔ سیمینار کے سارے مقالے اور بحث کا خلاصہ بھی کتابی صورت میں شائع کرنے کی سفارش کی گئی۔ اب یہ ساری سفارشات ترقی اردو بورڈ کی مجلس عاملہ کے سامنے پیش ہوں گی اور اس کے فیصلے کے مطابق کام شروع ہوگا۔ کتابوں کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

(۱) طبیعاتی علوم، حیاتیاتی علوم۔ سماجی علوم کی صورت حال پر ایک ایک کتاب۔
(۲) اقتصادیات، سوشیالوجی اور سیاسیات پر ایک ایک کتاب۔
(۳) نفسیات پر ایک کتاب۔
(۴) عالمی ادب کے میلانات پر ایک کتاب۔
(۵) بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل پر ایک کتاب۔
(۶) غذا کے مسائل پر ایک کتاب۔
(۷) آدمی کا ماضی، حال اور مستقبل۔ ایک کتاب
(۸) ہندوستانی پس منظر میں جدیدیت۔ ایک کتاب
(۹) سائنسی نظر۔ ایک کتاب۔
(۱۰) جدت پرستی اور جدیدیت۔ ایک کتاب۔
(۱۱) اخلاقیات کے متعلق جدید ترین تصورات۔
(۱۲) مذہب کے متعلق جدید ترین نظریات۔
(۱۳) ہندوستان ۔۔۔ تیس سال بعد

امید ہے کہ یہ کتابیں مجموعی طور پر اردو دنیا کو جدید ترین عالمی میلانات سے آگاہی بخشیں گی، انھیں سستی جدت پرستی سے بچائیں گی اور ماضی کی صالح روایات کے عرفان کے ساتھ موجودہ دور کے افکار و اقدار سے آشنا کرائیں گی۔ ترقی اردو بورڈ کے اس اقدام کی ستائش کرنی چاہیے۔

مولانا آزاد کالج رانچی کا رانچی یونیورسٹی سے الحاق

خوشی کی بات ہے کہ مولانا آزاد کالج رانچی کا الحاق رانچی یونیورسٹی سے باضابطہ ہو چکا ہے۔

یہاں ایک اقلیتی کالج کی عرصے سے اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، آرٹس کے تقریباً تمام مضامین کے مستند اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کی بحالی بھی ہو چکی ہے۔ اب سال رواں کے لئے اس کالج میں طلبہ کا داخلہ ہو رہا ہے۔ داخلہ میں طلبہ کو کچھ ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں جو دوسرے کالجوں میں ممکن نہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ اگست ۱۹۷۱ء کے پہلے ہفتے سے شروع ہو رہا ہے۔ ضرورت مند طلبہ داخلہ کا فارم بذریعہ ڈاک بھی منگا سکتے ہیں۔

۰ اے فضل (ایڈوکیٹ) نائب صدر

امروہہ کے کندن ماڈل انٹر کالج میں اردو کی تعلیم

امروہہ کے علمی اور ادبی حلقوں میں کندن ماڈل انٹر کالج کے پرنسپل جناب بسنت سنگھ جی کے اس قدم کو بہت سراہا جا رہا ہے کہ انھوں نے اپنے کالج میں امسال چھٹے کلاس سے آٹھویں کلاس تک اردو کی تعلیم کا باقاعدہ طور پر انتظام کر دیا ہے اور اس مقصد کے لئے اردو ٹیچر کا بھی تقرر کر دیا گیا ہے۔ ۰ رئیس انجمی امروہوی

حسن دہلوی کے نایاب دیوان کی دریافت

نئی دہلی:- حال ہی میں ازبکستان کے ادبی میوزیم کے کارکنوں نے امیر خسرو کے ہم عصر شاعر حسن دہلوی کی فارسی غزلیات کا ایک نایاب نسخہ دریافت کیا ہے۔ تاس خبر رساں ایجنسی نے بتایا کہ حسن دہلوی کے نایاب دیوان کا یہ قلمی نسخہ تاشقند کے ایک ازبک شہری کے پاس محفوظ تھا اس کے ساتھ ہی حسن دہلوی کے ایک معاصر مولانا نغانی کا دیوان بھی شامل ہے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ نایاب قلمی نسخہ غالباً شاہان ہرات کے کتب خانہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ۰ قومی آواز

تلگو شاعر کو گیان پیٹھ ایوارڈ

نئی دہلی: تلگو شاعر وشوا ناتھ ستیہ نارائن کو ایک لاکھ روپے کی مالیت کا بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ عطا کیا گیا ہے، جناب ستیہ نارائن کو ان کی "رزمیہ تخلیق" "سری رامائنہ کلپا ورکشمو" پر چھٹا گیان پیٹھ ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔ ۰ سیاست حیدرآباد

مسعود علی ذوقی

تمکین قریشی کی یاد میں

اردو کے کہنہ مشق شاعر اور عہد حاضر کے ممتاز غزل گو، جناب تمکین قریشی کا ۲۵ جون کو آگرے میں انتقال ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۱ سال تھی۔

تمکین قریشی ان برگزیدہ فنکاروں میں تھے جو اپنی شخصیت کے وقار اور حسن کردار سے اپنے فن کے ناموس کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ان کے صاف و شفاف لباس کی طرح ان کی روح بھی صاف و شفاف تھی۔ ان کی شکل و صورت میں بذات خود کوئی خاص بات نہیں تھی، مگر ان کے باطن کے اجالے نے ان کو وجیہ بنا دیا تھا اور جب وہ ہنستے تھے تو ان کے چہرے کی روشن شگفتگی میں ایک طرح کی روحانی دل آویزی شامل ہو جاتی تھی۔ وہ ایک خوش گو شاعر، ایک بلند انسان اور ایک نہایت مخلص دوست تھے۔ وہ دوستی کے پینگ بڑھانے میں جلد بازی کے بالکل قائل نہیں تھے۔ لیکن جب کسی کے دوست ہو جاتے تھے تو اپنا سارا خلوص اس پر انڈیل دیتے تھے۔ وہ دل آزاری کو سب سے بڑا گناہ تصور کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ صاف گو اس بلا کے واقع ہوئے تھے کہ کبھی کبھی ان کی صاف گوئی نادانستہ دل آزاری کا رنگ اختیار کر لیتی تھی لیکن جیسے ہی انھیں احساس ہوتا تھا کہ ان کے کھرے پن سے کسی دوست کو دکھ پہنچا ہے تو پھر تلافی اور دل جوئی کی کوئی ممکن تدبیر ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ خوبی اب بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

تمکین صاحب سوروں ضلع ایٹہ کے رہنے والے تھے۔ ایک طویل مدت تک محکمہ پولیس میں نیک نامی سے خدمت انجام دینے کے بعد سنہ ۱۹۵۲ء میں کورٹ انسپکٹر کے عہدے سے پنشن لے کر مستقل طور پر میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ادھر سال ڈیڑھ سال سے ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی لیکن شاید خود انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی خطرناک بیماری میں مبتلا ہیں۔ انتقال سے چند روز قبل ان کے اعزا علاج کی غرض سے انھیں آگرہ لے گئے تھے۔ یہ اس دنیا میں ان کا آخری سفر تھا۔

تمکین صاحب کی شخصیت پر ہندوستانی مسلمانوں کے پرانے کلچر کی گہری چھاپ تھی۔ وہ مذہب کے سختی سے پابند تھے مگر ان میں کٹرپن نہیں تھا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ سارے مسلمان نماز روزے کے پابند ہو جائیں، لیکن جو لوگ کسی سبب سے اس پر عمل نہیں کر پاتے تھے ان سے بھی رشتۂ محبت و اخوت استوار کرنے میں وہ ہچکچاتے نہیں تھے بشرطیکہ ان لوگوں کی انسانیت و شرافت مشکوک نہ ہو۔

جگر مرادآبادی مرحوم سے تمکین صاحب کو والہانہ محبت تھی۔ وہ جب ان کا ذکر کرتے تھے تو چہرہ کھل اٹھتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اپنی زندگی کے آخری پندرہ سال کے دوران جگر صاحب تمکین قریشی کو اپنا سب سے زیادہ مخلص اور گہرا دوست تصور کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جگر صاحب نے سنہ ۱۹۴۱ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک تمکین قریشی کو ۷۰ خط لکھے جو سب کے سب "مکاتیب جگر" میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں حضرت جگر کی کوتاہ قلمی اور ان کے شاعرانہ تساہل سے اچھی طرح واقف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جگر صاحب نے اپنی پوری زندگی میں کسی اور دوست کو اتنی بڑی تعداد میں خط نہیں لکھے ہوں گے۔ جگر کے آخری ایام علالت میں تمکین قریشی متعدد بار گونڈے گئے اور کئی کئی روز مسلسل وہاں قیام کر کے جگر صاحب کی تیمارداری اور دلجوئی کی۔ اپنی وفات کے بعد اپنی تصانیف کو خود غرض اعزا کی خورد برد سے محفوظ رکھنے کے لئے جگر مرحوم نے اپنی علالت کے زمانے میں "جگر ٹرسٹ" کے نام سے ایک وقف قائم کر کے تمکین صاحب کو اس کا متولی مقرر کر دیا تھا۔ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء میں جگر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کا تمکین قریشی کو بے حد صدمہ ہوا لیکن وہ بڑے ضبط و تحمل کے آدمی تھے پھر مذہبی اعتقاد کی پختگی نے بھی ان میں صبر و برداشت کی غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی۔ اس نے اپنے محبوب ترین دوست کی موت کا صدمہ بڑی پامردی کے ساتھ جھیل لے گئے۔ جگر صاحب کے انتقال کے بعد ہی سے ان کو اس بات کی بڑی فکر پیدا ہو گئی تھی کہ کسی ممتاز تعلیمی ادارے میں جگر مرحوم کی یادگار قائم کرا دیں۔ اس سلسلے میں انھیں خاصی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ بالآخر بڑی کوششوں کے بعد مرحوم و مغفور ڈاکٹر ذاکر حسین کی مدد سے وہ جامعہ ملیہ کی لائبریری میں "گوشۂ جگر" کے نام سے یادگار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں جگر کی تصانیف کے علاوہ ان کی ذات سے متعلق کئی اور چیزیں محفوظ ہیں جن میں ان کی چند غزلوں کے ٹیپ ریکارڈ بھی شامل ہیں۔

تمکین صاحب مشاعروں میں شرکت کرنے سے بہت گھبراتے تھے اور اگر شاذ و نادر کبھی شریک بھی ہوتے تو محض سامع بن کر۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شہرت کے بالکل حریص نہیں تھے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ اس دور کے شاعر تھے جب ترنم سے شعر پڑھنے کی ہوا بڑے زور و شور سے چل گئی تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مشاعروں میں تحت اللفظ سے شعر پڑھے

والوں کے آگے تحت اللفظ پڑھنے والوں کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ تسکین صاحب بھی اس رواج کی تقلید میں ترنم سے پڑھتے تھے یا یوں کہیے کہ کوشش کرتے تھے۔ مگر ان کا ترنم پرانی طرز کا اور خاصہ روائتی تھا اور شاید انھیں اپنی اس کمی کا خود بھی احساس تھا۔ اسی لیے وہ مشاعروں میں جانے سے گھبراتے تھے۔ لیکن اگر کبھی حسن اتفاق سے انھیں کسی ایسے مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوتا تھا جس میں جگر صاحب بھی موجود ہوتے تھے تو پھر ان کی مشکل بڑی آسانی سے حل ہو جاتی تھی۔ چونکہ جگر ان کی اس کمزوری سے واقف تھے اس لئے وہ از خود بڑی خندہ پیشانی سے ان کی غزل پڑھنے کی خدمت اپنے ذمے لے لیتے تھے۔ میرے علم میں یہ امتیاز صرف دو شاعروں کو حاصل ہوا ہے۔ ایک اصغر گونڈوی کو، دوسرے تسکین قریشی کو۔

تسکین صاحب کی شاعری بیشتر حسن و عشق کی شاعری ہے۔ ان کے تقریباً تمام اشعار بالعموم اسی محور کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ سرد و گرم چشیدہ آدمی تھے اور انھوں نے دنیا دیکھی تھی اس لئے زندگی کے بعض ایسے تجربوں کو بھی جو آفاقی اہمیت رکھتے ہیں، انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصل کارنامہ غزل کی ایسی عشقیہ شاعری ہے جو اپنی سلاست، رفتگی، نفاست، شائستگی اور مٹھاس کے اعتبار سے غزل گوئی کے موجودہ دور میں ایک جنس کمیاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ معاملات حسن و عشق کے گہرے رمز شناس تھے اور انھوں نے جا بجا بڑی کامیابی کے ساتھ محبت کی نفسیاتی نزاکتوں کی موشگافی کی ہے۔ وہ عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے لیکن ان کی شاعری پر سب سے گہرا اثر جگر مرادآبادی کا نظر آتا ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ ذہنی اور روحانی قرب نے ان دونوں دوستوں کو ایک جان دو قالب بنا دیا تھا۔ تسکین قریشی کی شاعری پر جگر کے گہرے اثرات میرے نزدیک ایک قدرتی اور ناگزیر واقعہ ہیں۔ اس سے تسکین کی شاعری کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بیشک وہ جگر کی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن نہ اس حد تک کہ ان کی اپنی آواز جگر کی آواز میں گم ہو کر رہ گئی ہو۔ میں تو جب بھی ان کا کلام پڑھتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے جگر کے اسلوب اور تسکین کے انداز فکر نے شیر و شکر ہو کر ایک نیا روپ اختیار کر لیا ہو جس میں اول الذکر کی شگفتگی و رعنائی اور موخر الذکر کی پاکیزہ خیالی اور نکتہ دانی دونوں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے ہوں۔

تسکین صاحب کے تین مجموعے، علی الترتیب "سرمایہ تسکین"، "گلگونہ" اور "متاع تسکین" شائع ہو چکے ہیں۔ "سرمایہ تسکین" میں صرف نظمیں ہیں۔ "گلگونہ" میں تسکین صاحب کا نعتیہ کلام ہے اور "متاع تسکین" میں ان کے مجموعی کلام کا انتخاب۔

ان تین کتابوں کے علاوہ انھوں نے چند سال ہوئے وہ تمام خطوط تاریخ وار مرتب کر کے جو جگر صاحب نے انھیں لکھے تھے "مکاتیب جگر" کے نام سے چھپوا دیے تھے۔

تسکین صاحب میرے ساتھ غیر معمولی خلوص برتتے تھے۔ اگر کبھی میری طرف سے خط لکھنے میں لمبا وقفہ ہو جاتا تو فوراً خط لکھ کر تشویش کا اظہار کرتے۔ وہ میری دعوت پر کئی بار علی گڑھ آئے اور میرے غریب خانے پر قیام کیا۔ یہاں ان کے کچھ رشتہ دار بھی ہیں۔ انھوں نے بہت اصرار سے انھیں اپنے گھر پر ٹھہرانا چاہا لیکن تسکین صاحب کی وضع داری نے اسے قبول نہیں کیا۔ یوں تو ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۰ء تک تسکین صاحب سے میری تین چار ملاقاتیں مختلف شہروں اور مختلف موقعوں پر ہو چکی تھیں لیکن یہ ملاقاتیں اتنی مختصر اور سرسری تھیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی طرح نہیں پہچان سکے۔ ان سے میری پہلی اور بھرپور ملاقات دراصل اس موقع پر ہوئی جب وہ آل احمد صاحب سرور کی بیٹی، رجبیں کی شادی میں شرکت کے لئے میرٹھ سے علی گڑھ آئے تھے۔ وہ ایک روز کے بعد تقریب سے فارغ ہو کر جب تسکین صاحب میرٹھ واپس گئے تو میرے دل و دماغ پر اپنی شخصیت کا گہرا اور خوشگوار اثر چھوڑ گئے۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا اور دوستی کی منزلیں جلد جلد طے ہوتی چلی گئیں۔ پھر ۱۹۶۲ء میں پہلی بار مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تو مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تسکین صاحب میں اتنی بہت سی خوبیاں ہیں کہ آسانی سے گنوائی نہیں جا سکتیں۔ جن ادیبوں کے اخلاق، شرافت اور خلوص نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے ان کی فہرست میں تسکین صاحب کے نام کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ افسوس پرانے چراغ جو بڑی استقامت کے ساتھ سالہا سال سے روشن تھے، اب ایک ایک کر کے بجھتے جاتے ہیں۔ جو رہ گئے ہیں وہ ٹمٹما رہے ہیں۔ اس عالم میں بے اختیار ہماری نگاہیں نئے چراغوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہواؤں کے جھونکے تیز ہوتے جاتے ہیں اور نئے چراغ ابھی تک اپنی نئی روشنی کے بوجھ کو سنبھالنے کی فکر میں لڑکھڑا رہے ہیں۔ کیا ان کا اجالا اندھیروں پر غالب آ جائے گا؟؟ — یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

"ہماری زبان"

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ ملحوظ رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

(ادارہ)

مترجم پریم ناتھ دت

رگوید۔ I - 113

اوشا[1]

اُجالا ہوگیا۔ لاثانی اُجالا۔ روشنی دور دور تک پھیل گئی
خورشید کی نمود پر، تاریکی کافور ہوگئی، صبح صادق کا ظہور ہوا
مطلع صاف ہوگیا، اندھیرے نے اپنی جائے قیام اسے دے دی
دن اور رات، اختلاف رنگ کے باوجود یک دل ہیں،
نہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں، نہ مزاحم
دونوں لافانی ہیں، رنگ روپ بدل کر، ایک دوسرے کے
آگے پیچھے رواں دواں ہیں
خدائی احکام کی تعمیل میں، ایک ہی راستے پر، باری باری
گام زن ہیں
نغمہ ہائے صباحی کی گت تال پر، اوشا اپنا شاندار دریچہ
کھول دیتی ہے، ہم محو دیدار ہو جاتے ہیں
وہ ساری دنیا کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ گوناگوں نعمتیں عطا کرتی
اور زندہ مخلوق کو بیدار کر دیتی ہے
وہ نیند کے ماتوں کو جگا دیتی ہے، کسی کو آسائش، کسی کو
عبادت اور کسی کو مشقت کے لئے
انھیں بھی جو سہانے سپنے لے رہے ہیں وہ ان سب کو
بیدار کر دیتی ہے۔
کسی کو سرداری و سروری کے لئے، کسی کو شہرت و شادمانی
کے لئے، کسی کو یافت و منفعت اور کسی کو مزدوری کے لئے
وہ سب کو اپنے اپنے دھندوں میں لگ جانے کے لئے
اٹھا دیتی ہے
وہ دیکھیے ہیں: نازائیدہ نور ہے، ظاہر و آشکار ہے،
خوبرو دوشیزہ ہے، لباس فاخرہ میں ملبوس، خندہ بر جمال
اے خازن جہاں! ہمیں آج کی صبح، گوناگوں نعمتوں سے نوازا
تو نت نئے دن سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے، گذشتہ کل
کے بعد نئے آج کو پھر جلوہ افروز ہے
تو آتے ہی، زندوں کو تحریک و حرکت کے لئے آمادہ کر دیتی
ہے، مگر مردوں کو نہیں چھیڑتی
وہ لوگ اب کہاں، جو اگلے وقتوں میں منہ اندھیرے تیرے
استقبال کے لئے اٹھ بیٹھتے تھے
ہم لوگ، جو اب زندہ ہیں، اس کے نمودار ہونے پر
ہی اس کے نظارے سے فیض یاب ہوتے ہیں
اٹھو، حیات و زیست کا دروازہ وا ہوگیا، تاریکی غائب
ہوگئی، روشنی جلوہ گر ہے
اوشا نے سورج کی آمد کے لئے راستہ چھوڑ دیا، ہم اب
اس منزل میں ہیں کہ درازیٔ عمر کی تمنا کر سکیں
روشن و تاباں فجر کی قصیدہ خوانی کے لئے، پجاری اور
شاعر اٹھ بیٹھتے ہیں
اے فیاض دوشیزہ، جو تیری تعریف کرتا ہے، تو اس پر نور
افشاں ہو، زندگی کی نعمتوں اور اولاد سے انھیں نواز!

---

[1] شفق پھوٹنا۔

■

(بقیہ صفحہ ۸ سے آگے)

اس لئے انجمن اردو کے تمام خدمت گذاروں، اردو کی انجمنوں، تہذیبی اداروں، طلبہ اور اساتذہ کی تنظیموں اور لسانی اقلیتوں کے تحفظ کے لئے کام کرنے والی تمام پارٹیوں اور آزاد خیال افراد سے اپیل کرتی ہے کہ وہ حکومت کی موجودہ پالیسی کے خلاف آواز بلند کریں اور اردو والوں کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کسی جد و جہد سے دریغ نہ کریں۔ • نامہ نگار

اردو کے جائز مقام کے حصول کے لئے سرگرم اور مخلصانہ مساعی ناگزیر

حیدرآباد۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے کہا ہے کہ موجودہ حالات میں اردو کے جائز مقام کے حصول کے لئے ہمیں جد و جہد کے لئے تیار رہنا چاہئے جناب حبیب الرحمٰن اردو ہال حمایت نگر میں طلبائے قدیم اردو آرٹس کالج کی اسیوسی ایشن کے افتتاحیہ جلسہ میں صدارتی تقریر کر رہے تھے۔

جناب حبیب الرحمٰن نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خاتمہ کے لئے ہمیں اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہئیں جناب حبیب الرحمٰن نے اردو آرٹس کالج کے قیام کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ابتدا میں یہ کام انتہائی دشوار نظر آرہا تھا جب دانشوروں کے سامنے یہ پروگرام رکھا گیا تو اتنے بڑے کام کے کرنے کے لئے بعض نے اسے ناممکن قرار دیا لیکن پھر سب کے تعاون عمل سے کالج کا قیام عمل میں آیا اور آج اردو زبان کی خدمت اور اس کی بنیادیں مضبوط ہو رہی ہیں اور یہ کالج سارے ملک کے لئے پیغام عمل ہے۔

• نامہ نگار

مراسلات

نو دریافت دیوان غالب کے سلسلے میں

پروفیسر گیان چند صاحب اس احقر کے محسن اور کرم فرما ہیں منجملہ اور عنایات کے حال ہی میں موصوف محترم نے اس کو "فنا فی التشکیک" فرمایا ہے۔ یہ احقر اگرچہ اپنے زعم میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا لیکن پروفیسر صاحب موصوف کی اس عنایت کے لئے شکر گزار ہے۔

موصوف نے ہماری زبان کے ۱۵ جولائی ۱۹۷۱ء کے شمارے میں میری زبانی گفتگو نقل کرکے فرمایا ہے کہ محمد انصار اللہ کے نزدیک "یہ نسخہ غالب ہی کی تصنیف ہے۔" میرے مختلف مضامین شاہد ہیں کہ مجھے اس میں مندرج اس کلام کو جو پہلی بار غالب سے منسوب ہو کر ہمارے سامنے آیا ہے تا وقتیکہ کوئی سند نہ مل جائے غالب کا تسلیم کرنے میں بہت زیادہ تامل ہے۔ اس میں کم از کم ایک غزل میر امانی اسد کی ضرور ہے۔ باقی نو دریافت کلام بھی تحقیق طلب ہے۔

اس نسخے کی کتابت کے لئے آج تک کوئی ایسا سنہ نہیں پیش کیا جا سکا جس کی صحت تسلیم کی جا سکے۔ پروفیسر صاحب نے زبانی گفتگو میں فرمایا تھا کہ "دو چار سال آگے پیچھے اس کی کتابت ہونے سے کوئی فرق نہیں ہوتا" میرے نزدیک دو چار سال نہیں، ایک سال، بلکہ ایک مہینہ اور کبھی ایک دن اور ایک ساعت کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور اس سے دور رس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اپنے مراسلے میں موصوف نے فرمایا ہے کہ

"یہ پہلو کہ یہ غالب کے ہاتھ کی تحریر ہے کہ نہیں میرے نزدیک اتنا زیادہ اہم نہیں جتنا یہ کہ اس کے جملہ مشمولات متن، اصلاحیں اور حاشیے غالب ہی کی تصنیف ہیں اور یہ مخطوطہ نسخہ بھوپال اول سے پہلے کی تصنیف ہے۔"

میری ساری گفتگو اسی باب میں تھی کہ یہ نسخہ "بخط غالب" نہیں ہے۔ اگر یہ پہلو اہمیت نہیں رکھتا تو اس پر بحث کی ضرورت ہی کہاں رہ جاتی ہے؟ متداول کلام غالب جو اس کے متن و حاشیہ پر ہے اس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ دعویٰ کہ یہ مخطوطہ نسخہ بھوپال اول سے قدیم تر ہے بے بنیاد ہے میں اپنے مضامین میں بار بار اس کا ذکر کر چکا ہوں اس وقت مجھے صرف ایک بات پھر کہنا ہے کہ نسخہ بھوپال اول غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ غالب کے ہاتھ کا وہ مسودہ جس پر نسخہ بھوپال اول مبنی ہے یقینی طور پر اس سے پہلے کا ہوگا اس کا زمانہ کتابت اس طرح متعین کیا جا سکتا ہے کہ اس میں امیر شوکت کا نام نہیں ہے، غالب پچیس سال کی عمر میں ان کی تقلید سے تائب ہوئے اگر ان کی تقلید کا زمانہ سات آٹھ سال بھی مانیں تو مسودہ کی تکمیل سنہ ۱۲۳۰ھ سے پہلے ہو چکی ہوگی اور اگر نو دریافت مخطوطہ اس سے قدیم تر ہے تو اس کی کتابت (اگر یہ کسی اور ایسے مسودہ کی نقل سمجھا جائے جو بخط غالب تھا تو اس مسودہ کی کتابت) سنہ ۱۲۳۰ھ سے پہلے ہو چکنی چاہئے تھی۔ ترقیمہ میں دن، تاریخ اور مہینہ ہے اگر اس کو معتبر سمجھا جا سکے تو سال کتابت معلوم کر لینا ناممکن نہیں البتہ دیکھنا یہ ہوگا کہ اس سال میں غالب کے لئے ایسا دیوان تصنیف کرکے اس کی کتابت کا مکمل کر لینا ممکن بھی تھا یا نہیں۔ لیکن اس طور پر آج تک کسی صاحب نے غور نہیں کیا۔

میں نے اپنے ایک مراسلے میں دو صاحبوں کے تاثرات ان کا نام لئے بغیر نقل کئے تھے مجھے اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے کہ میں یہ سمجھتا رہا کہ لوگ مسائل پر غور کرتے ہیں لیکن پروفیسر صاحب موصوف نے زبانی گفتگو میں فرمایا کہ

"میں یہ سمجھا تھا کہ یہ کسی مجہول شخص کی باتیں ہیں اس لئے میں نے ان پر غور بھی نہیں کیا۔"

اب اپنے حالیہ مراسلے میں موصوف نے نام نقل نہ کرنے پر اعتراض بھی کیا ہے اس طرح یہ بات صاف ہو گئی کہ اس "نام پرستی" کے دور میں مسائل و نکات پر توجہ نہیں کی جاتی۔

اس مخطوطے کو اگر بغور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ عہد غالب کی تحریر ہرگز نہیں ہے۔ بزرگ محترم پنڈت رامیشور دیال صاحب (جن کا ذکر خیر خطوط غالب مرتبہ مالک رام صاحب کے مقدمہ میں بھی ہے) نے اعظم گڑھ کے زمانہ قیام میں آج سے کم و بیش تیس سال قبل غالب کے چند خطوط خریدے تھے اور کافی اجرت دے کر کم و بیش اسی خط میں ان کی نقلیں تیار کرائی تھیں مجھے یقین ہے کہ بزرگ محترم کے پاس اب بھی وہ نقلیں موجود ہوں گی۔ حروف کی ساخت میں ظاہری مماثلت اس بات کا ثبوت ہرگز نہیں کہ وہ تحریر اصل ہے۔ غالب کے عہد کی کوئی تحریر بھی دیکھئے تو حروف منقوطہ پر نقطوں کے مقررہ تعداد میں بنانے کا اس وقت رواج نہ تھا پ کے نیچے کبھی تین کبھی کم نقطے بنائے جاتے تھے کبھی بالکل حذف کر دیتے تھے اسی طرح جہاں ایک نقطہ چاہئے وہاں بھی کبھی زائد اور کبھی بالکل محذوف ہوتا تھا اس نسخے کے کاتب نے پ اور ب دونوں کے نیچے اور ت، ث دونوں کے اوپر صرف ایک نقطہ بنانے کا التزام کیا ہے یہ التزام غیر معمولی بات ہے اور اغلب ہے کہ تحریر کو قدیم ظاہر کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔

غالب کی کوئی تحریر دیکھئے وہ اگر گ پر ایک مرکز بناتے تھے تو ک پر دو مرکز بھی انھوں نے بنائے ہیں یہاں بھی ان کی تحریر میں کوئی التزام نہیں ملتا مثلاً انھوں نے لکھا

"تم سے کہوں تو کس سے کہوں"

پہلے "کہوں" کے ک پر دو مرکز صاف بنائے ہیں۔ اس مخطوطے کا کاتب غالب کے انداز تحریر کی خصوصیات سے ناواقف تھا قدیم تحریروں کے مطابق اس نے ک اور گ ہر جگہ ایک ہی مرکز بنانے پر اکتفا کیا ہے۔ غالب سے پہلے کی تحریروں میں یہ صورت بھی مل سکتی ہے) کم از کم یہ دو امور تو ایسے ہیں جن کو کوئی بھی شخص دیکھ سکتا ہے لیکن جب مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے بجائے یہ کہا جائے کہ ؎

وہ اپنا منہ اُدھر کرلیں، ہم اپنا منہ اِدھر کرلیں

تو پھر مزید کچھ کہنے کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

علی گڑھ۔ • محمد انصار اللہ

امی ہلاہل

ارشد صدیقی صاحب نے اپنی نظم امی ہلاہل مطبوعہ ہماری زبان ۱۵ر جولائی ۱۹۷۱ء کے آخر میں ہندی کا مشہور دوہا۔

امی ہلاہل مدبھرے سیت، سیام، رتنار

جیت، مرت، جھک جھک پرت جہی چتوت اک بار

نقل کرکے اس کے آگے قوسین میں بہاری درج فرمایا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ آج بھی اس دوہے کو شرنگار رس کے مشہور ہندی شاعر بہاری کی تصنیف سمجھ رہے ہیں۔ کسی زمانے میں ہندی والوں کے ایک طبقے میں بھی یہی غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی۔

اصل میں یہ دوہا بہاری کا نہیں بلکہ سید غلام نبی رس لین بلگرامی (سنہ ۱۱۱۱ھ ۔ سنہ ۱۱۶۳ھ) کا ہے۔ بہاری ست سئی کے کسی نسخے میں یہ دوہا شامل نہیں ہے بہاری کے مستند ترین مجموعہ کلام بہاری رتناکر مرتبہ شری جگن ناتھ رتناکر میں بھی یہ دوہا غائب ہے جبکہ سید غلام نبی کی کلیات رس لین گرنتھاولی (مرتبہ سدھاکر پانڈے۔ ناگری پرچارنی سبھا کاشی۔ پہلا ایڈیشن۔ سمبت ۲۰۲۶ بکرمی) کے صفحہ ۲۵۸ پر یہ دوہا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ رس لین کی مشہور تصنیف انگ درپن میں بھی نیتر ورنن کے ذیل میں نمبر ۳۵ پر یہی دوہا دیا ہوا ہے۔

یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ الہ آباد کے ہندی رسالے چاند (مئی سنہ ۱۹۴۰ء) میں شری ستھرا داس گجراتی کے رنگین نقش ظلم مرگ نینی (آہو چشم) کے نیچے یہی دوہا نقل کرکے اسے کوی ور رحیم (نواب عبدالرحیم خانخاناں) کی تصنیف بتایا گیا ہے جو سہو محض ہے۔

نجیب آباد۔ • پرکاش مونس

درسی کتابوں کا مسئلہ

"ہماری زبان" کی گذشتہ دو اشاعتوں میں درسی کتابوں کے سلسلے میں آپ کا اداریہ نہایت مفید اور توجہ طلب ہے۔ ابتدائی اور ثانوی منزل کے لئے درسی کتابوں کا مسئلہ بہت اہم اور بنیادی ہے۔ اجتماعی طور سے آج تک اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں میں بیشتر ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو جدید تدریسی طریقوں کے مطابق نہیں لکھی گئی ہیں، جن میں معلومات بھی OUT OF DATE ہیں اور زبان و بیان بھی معیاری نہیں۔ اس کے گوناگوں اسباب ہیں۔ اردو کے پبلیشر رائلٹی برائے نام دیتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں تجربہ کار ماہرین کا تعاون حاصل نہیں ہوتا اور کتابیں محض خانہ پری کے طور پر کسی طرح لکھوا کر شائع کردی جاتی ہیں۔ انجمن کو اس کی طرف پہلے توجہ دینی چاہئے تھی۔ بہرحال اب بھی وقت گیا نہیں ہے۔ پروگرام بنا کر کام شروع کیا جائے تو یقیناً کامیابی ہوگی۔

اس سلسلے میں ایک امر کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں مرکزی انجمن جب بھی اس طرح کے ماہرین کی کمیٹی بناتی ہے تو مشرقی ہند (خصوصاً بنگال و بہار) کو فراموش کرجاتی ہے حالانکہ یہاں متعدد اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک اردو زبان و ادب کی تعلیم ہوتی ہے۔ علاقائی ماہرین کو شامل کئے بغیر جو کتابیں تیار ہوں گی ان میں علاقائی جھلکیوں کا فقدان ہوگا اور یہ پورے ملک کے لئے کارآمد نہیں ہوسکیں گی۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی اس سے اتفاق ہوگا۔

کلکتہ۔ • علقمہ شبلی

انجمن کی خبریں

اردو کے حقوق کے تحفظ کیلئے جدوجہد کی اپیل

حیدرآباد ۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے حسب ذیل صحافتی بیان جاری کیا ہے ۔

اعلیٰ سطح کی ایک کانفرنس میں جس میں چیف منسٹر وزیر تعلیم آندھرا وینکٹیشور اور عثمانیہ کے وائس چانسلر، تعلیمات کے سکریٹری اور ناظم شریک تھے فیصلہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۷۲-۷۳ء کے تعلیمی سال سے تینوں یونیورسٹیوں کی ڈگری کلاسوں کا ذریعہ تعلیم تلگو کر دیا جائے۔ انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش اس فیصلہ کا خیرمقدم کرتی ہے اور توقع رکھتی ہے کہ اس اقدام سے ریاست کی تعلیمی اور تہذیبی سطح بلند ہوگی اور تلگو مادری زبان والے طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقع ملے گا۔

انجمن کو توقع تھی کہ جامعاتی سطح پر جب بھی تلگو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے گا حکومت اور ارباب جامعہ اردو کو نظر انداز نہیں کریں گے اس لئے کہ اردو نہ صرف آندھرا پردیش کی دوسری بڑی علاقائی زبان ہے بلکہ مخصوص تاریخی اسباب کی وجہ سے اس کو نظم ونسق اور تعلیم دونوں میدانوں میں امتیازی مقام حاصل رہا ہے اور ہندوستان کی پہلی علاقائی زبان ہے جس کو حیدرآباد میں جامعاتی سطح پر ذریعہ تعلیم بننے کا فخر حاصل رہا ہے لیکن کانفرنس کے بعد وزیر تعلیم نے اخبار نویسوں کو کانفرنس کے فیصلوں اور حکومت کی پالیسی سے واقف کراتے ہوئے اردو کا انتہائی سرسری انداز میں ذکر کر کے اردو والوں کی توقعات پر پانی پھیر دیا۔ ان کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ جونیر کالجوں کے قیام کے موقع پر انھوں نے جس ذہنی تحفظ سے کام لیتے ہوئے اردو کو سرے سے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی وہ ذہنی تحفظ آج بھی باقی ہے۔

وزیر تعلیم نے اردو اور ہندی ذریعہ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے صرف ایک جملہ میں حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا ہے کہ "عثمانیہ یونیورسٹی کے علاقے میں اردو اور ہندی کی موجودہ سہولتیں برقرار رہیں گی"۔ یہ جملہ انتہائی مبہم غیر تشفی بخش اور پریشان کن ہے۔

اردو کا مسئلہ صرف عثمانیہ یونیورسٹی کے علاقے تک محدود نہیں ہے اس لئے وزیر تعلیم کے اس اعلان سے آندھرا کے اضلاع میں رہنے بسنے والوں پر گویا اردو تعلیم کے دروازے بند کر دئے گئے ہیں۔ جمہوریت کے اس دور میں یہ لسانی جبر ناقابل برداشت ہے۔

جہاں تک جامعہ عثمانیہ کے علاقہ یعنی تلنگانہ کا تعلق ہے۔ بحالت موجودہ یہاں صرف ایک اردو آرٹس کالج ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اگر وزیر تعلیم یہ سمجھتے ہیں کہ یہی ایک کالج پورے تلنگانہ کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کر سکتا ہے تو اس کو ان کی سادہ لوحی پر محمول کیا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈگری کلاسوں میں تلگو ذریعہ تعلیم کی ترویج اور انگریزی ذریعہ تعلیم پر تحدید کے بعد یہ کالج صرف شہر حیدرآباد کی ضرورتوں کی تکمیل کرنے سے بھی قاصر رہے گا اور خود شہر میں اردو ذریعہ تعلیم کے کئی کالج قائم کرنے ہوں گے۔

اردو آرٹس کالج ایک ملحقہ کالج ہے۔ کسی ملحقہ کالج پر تکیہ کر کے حکومت اور یونیورسٹی اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی بلکہ حکومت اور یونیورسٹی دونوں پر لازم آتا ہے کہ اپنے اپنے کالجوں میں بھی اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام کرے۔ اردو آرٹس کالج میں ہیومانیٹیز کے صرف چند شعبوں کا انتظام ہے۔ کامرس اور سائنس کی تعلیم تو اس کالج میں ہوتی ہی نہیں اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ شہر میں حکومت اور یونیورسٹی اپنے تمام کالجوں میں ہیومانیٹیز، کامرس اور سائنس کے تمام شعبوں میں تلگو کے ساتھ ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کی متوازی جماعتوں کا انتظام کرے تلنگانہ کے اضلاع کی حد تک کم از کم ہر ضلع کے مستقر پر اور آندھرا کے ایسے اضلاع میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہو اردو کی متوازی جماعتیں قائم کی جائیں۔ اسی صورت میں ریاست کے اردو بولنے والوں کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

انجمن ترقی اردو پچھلے دو سال سے اپنی کانفرنسوں میں ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کے بعد اردو کے موقف پر غور کرتی اور اس مسئلہ سے متعلق قراردادیں منظور کرتی رہی ہے۔ یہ قراردادیں وقتاً فوقتاً حکومت کو بھیجی جاتی رہی ہیں تاکہ ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کے فیصلہ کے موقع پر وہ اردو والوں کے خیالات، جذبات، مطالبات اور ان کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر صحیح اقدام کر سکے لیکن افسوس ہے کہ ہماری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

انٹرمیڈیٹ کے امتحان ختم ہونے کو ہیں نتائج نکلتے ہی ڈگری کلاسوں میں داخلہ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا اور اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ اپنے حق کے لئے جدوجہد کرنے اور جمہوری حربے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس لئے انجمن حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی معلنہ پالیسی پر نظر ثانی کرے اور کسی بحران کے پیدا ہونے سے پہلے ہی شہر اور اضلاع میں اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کا اعلان کر دے۔

انجمن آندھرا پردیش کی تینوں یونیورسٹیوں سے بالعموم اور جامعہ عثمانیہ سے بالخصوص اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنے اپنے کالجوں میں ہیومانیٹیز، سائنس اور کامرس کی متوازی جماعتیں کھول کر لسانی رواداری کا ثبوت دیں۔

وقت بہت کم ہے اور نیا تعلیمی سال شروع ہونے کو ہے اس لئے ہمیں تیزی کے ساتھ رائے عامہ کو اپنا ہمنوا بنانا ہے

(باقی صفحہ ۹ پر)

اخبار واذکار

اردو کے لئے ہر ممکن سہولت کا وعدہ

لکھنؤ:- وزیر اعلیٰ کملاپتی ترپاٹھی نے ریاستی اسمبلی میں اعلان کیا کہ اترپردیش کو دو لسانی ریاست بنائے بغیر اردو کی تعلیم اور ترقی کے سلسلے میں ریاستی حکومت جو بھی ممکن ہو سکے گا کرے گی اور بجٹ تقریر میں اردو کو سہولتیں دینے سے متعلق جن فیصلوں کا اعلان کیا گیا ہے وہ اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے یہ اعلان بجٹ پر مباحثہ کے دوران اردو کے مخالف و موافق ممبروں کے سوالات کے جواب میں کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اردو جیسے مسلمانوں کی زبان ہے ویسے ہی ہندوؤں کی بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اترپردیش ایک لسانی ریاست ہے اسی ایوان کے فیصلے کے بموجب ہندی ریاست کی زبان ہے، اترپردیش کو دو لسانی ریاست بنانے کا منصوبہ کسی کے سامنے نہیں ہے۔

وزیر اعلیٰ نے کہا "اردو ہماری ریاست کی زبان ہے یہ ملی جلی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس سے ویسے ہی محبت کی جانی چاہئے جیسے کسی دوسری زبان سے کی جاتی ہے جہاں تک اردو کی تعلیم اور ترقی سے متعلق سہولتوں کا سوال ہے اترپردیش کو دو لسانی ریاست بنائے بغیر حکومت جو کچھ بھی ممکن ہو سکے گا کرے گی۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ہم مادری زبان میں تعلیم کی سہولتیں دینا چاہتے ہیں ریاست میں ۰۰ ہزار پرائمری اسکول ہیں ان میں سے جہاں بھی ممکن ہو سکا وسائل کو دیکھتے ہوئے اردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے گا۔ وزیر اعلیٰ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم ہونا ہماری پالیسی ہے۔ اردو کو اب جو سہولت دی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہو تو اس کو دور کر دیں۔ انھوں نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ اردو جن کی مادری زبان ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان انھیں تعلیم کے معاملے میں سہولت دی جانی چاہئے۔ • قومی آواز

حکومت یوپی نے اردو کو جو کچھ دیا نہ دینے کے برابر ہے

لکھنؤ:- اردو کو اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں وزیر اعلیٰ کے انکار پر اظہار خیال کرتے ہوئے چند اخباری نمائندوں کے سامنے شری رام سنگھ کھنہ نے کہا کہ وزیر اعلیٰ کا یہ جواب مایوس کن اور ان تمام یقین دہانیوں کی خلاف ورزی ہے جو مسز اندرا گاندھی کی طرف سے الیکشن کے وقت اور اس کے بعد متعدد بار کی گئی ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے اردو جیسی صوبہ میں مقبول اور بولی جانے والی زبان کو جس قسم کی سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے وہ عملاً صفر اور کچھ نہ دینے کے برابر ہے۔
• ریاست جدید

اردو کے حامی کانگریس ممبروں کو مایوسی

لکھنؤ: ۲۳ر جولائی پتہ چلا ہے کہ وزیر اعلیٰ اترپردیش جناب کملاپتی ترپاٹھی نے اردو کے سلسلہ میں جس سرکاری پالیسی کا اسمبلی میں اعلان کیا ہے اس سے محبان اردو میں انتہائی بے چینی پائی جاتی ہے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ لوک سبھا کے الیکشن کے موقع پر جو وعدے اردو والوں سے وزیر اعظم نے کئے تھے اس کو صوبائی حکومت عملی جامہ پہنانے کے بجائے اب اس مسئلہ کو پھر کولڈ اسٹوریج میں بند کرنے کی کوشش کر رہی ہے اس بے چینی کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ حکمراں کانگریس کے مسلم ممبروں میں بھی بڑی بے چینی پائی جاتی ہے چنانچہ کل ایک کانگریسی ممبر بیگم اعجاز رسول کی کوٹھی پر مسلم کانگریسی ممبران کا ایک جلسہ ہوا جس میں اردو کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد مسلم ممبروں کی ایک کمیٹی بھی بنا دی گئی جو اس سلسلہ میں اعلیٰ سطح پر بات کرے گی اور انھیں متاثر کرنے کی کوشش کرے گی۔ • سیاست کانپور

اردو کے بارے میں کئے گئے وعدوں سے انحراف

کانپور:- حکمراں کانگریس کے سرگرم ممبر جناب ظہیر الحسن نے اخبار وں کے نام ایک بیان جاری کرتے ہوئے صوبہ کی موجودہ حکومت پر اردو کے بارے میں کئے گئے وعدوں سے انحراف کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔

آپ نے کہا کہ ۱۲ر جولائی کو یوپی کے وزیر اعلیٰ نے جو بیان دیا ہے اس سے تمام امیدوں پر پانی پھر گیا، انھوں نے نہ تو اردو کو دوسری سرکاری زبان ہی بنانے کا اعلان کیا اور نہ ہی جونیر درجات تک اس کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ اس طرح الیکشن کے وقت اردو کے سلسلہ میں کی گئی تمام ہمدردیاں اور وعدوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔

جناب ظہیر الحسن نے حکومت یوپی سے مزید مطالبہ کیا کہ اب بھی وقت ہے کہ وہ اسی سیشن میں اردو کے بارے میں کوئی ٹھوس اور واضح پالیسی کا اعلان کرے، تاکہ تمام اردو وال حضرات کے شکوک کا ازالہ ہو سکے اور خود حکمراں کانگریس کو بھی آئندہ ہونے والے اسمبلی کے انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہو سکے۔ • سیاست کانپور

اردو کے سلسلے میں کانگریس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شرما کی رائے

نئی دہلی، ڈاکٹر شنکر دیال شرما ممبر پارلیمنٹ و جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کہا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل نہایت شاندار ہے یہ زبان یہیں کی پیداوار ہے اگر آج اس کی ترقی ...

کچھ دشواریاں حائل ہیں تو وہ گذشتہ دنوں کی تاریخ کا ردعمل ہے لیکن وہ تیل جو اردو کے خلاف عناد و بغض کا دل و دماغ میں دیئے جلا رہا تھا اس کا ذخیرہ اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔

اردو ہندوستان کی زبان ہے اور اس کی ترقی میں ہندو مسلمان اور سکھ عیسائی سب نے ہی حصہ لیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی زلفوں کو ہندوؤں نے زیادہ سنوارا ہے اس لئے میں اردو کے مسئلہ کو کسی طرح سے بھی مسلمانوں کا مسئلہ نہیں مانتا ہیں اردو زبان کو ہر طرح سے ہندوستان کی رواداری کا سمبل (علامت) تسلیم کرتا ہوں میں یہ نہیں مانتا کہ زبانیں محض حکومت کی سرپرستی سے زندہ رہتی ہیں۔ اب سنسکرت کہاں ہے۔ فارسی کہاں ہے۔ اردو کو بھی ایسے ہی جھٹکے لگ رہے ہیں جب کہ انگریزی زبان بدیشی ہوتے ہوئے بھی اپنی صلاحیت کی وجہ سے انگریزوں کی عدم موجودگی میں روبہ زوال ہونے کے بجائے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ آج کتنے اردو والے ہیں جو اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دے رہے ہیں کس نے انھیں منع کیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اردو میں تعلیم نہ دیں۔ لیکن سب کے سامنے اپنے ذاتی اغراض ہیں۔ ہر اردو والوں کا اہم فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو گھریلو طور پر ہی اردو کی تعلیم دلائے جہاں تک ظاہری حالات کا تعلق ہے آزادی کے بعد جس رفتار سے اردو رسائل شائع ہو رہے ہیں اور کتابیں طبع ہو رہی ہیں اس کا مقابلہ آزادی سے قبل کے دور سے کیا جائے تو یہ کہنا ہوگا کہ ماضی کی بہ نسبت حال میں اردو ترقی کر رہی ہے۔

اردو زبان کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری بڑی حد تک اردو دوستوں کی ہے ان کا بھی فرض ہے کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی جد و جہد کریں اسے مقبول بنائیں اور ایسے زیورات سے سجا دیں کہ لوگ اردو سیکھنے کے لئے بیتاب ہو جائیں۔ جناب شرما نے کہا کہ جوں جوں سوچنے کے ڈھنگ میں پختگی آتی جائے گی اور پرانے زخم مندمل ہوتے جائیں گے اردو کی مخالفت خود بخود ختم ہوتی چلی جائے گی۔

• ہمارا نعرہ

مولانا خیر بہوردی کے انتقال پر اظہار غم

دلی :۔ انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی جنرل سکریٹری بیگم حمیدہ سلطان اور جائنٹ سکریٹری جناب بہار برنی نے ایک بیان میں مولانا خیر بہوردی کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ بیان میں انجمن ترقی اردو کی تنظیم کے سلسلے میں خصوصاً خیر بہوردی مرحوم کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ اردو زبان کے ایک سچے بہی خواہ تھے۔ انھوں نے تمام عمر اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے لگن کے ساتھ کام کیا۔ • الجمعیۃ

(۲)

اردو کے مایۂ ناز ادیب اور محقق مولانا خیر بہوردی کے سانحۂ ارتحال پر گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلبہ کا ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبہ منعقد ہوا۔ جلسہ میں صدر جلسہ ڈاکٹر سلام سندیلوی اور ڈاکٹر احمر لاری نے مرحوم کی خاموش ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسہ کے اختتام پر ایک تعزیتی قرارداد اتفاق رائے سے پاس کی گئی۔ • فضل امام رضوی

(۳)

گورکھپور :۔ مولانا خیر بہوردی کے انتقال پر دفتر "اشتراک" میں ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت پیام گورکھپوری ہوا۔ جس میں ان کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور ایک تعزیتی تجویز کے ذریعہ مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

• تبیش اشک

(۴)

ڈاکٹر سلام سندیلوی کی صدارت میں دور گورکھپور کے مکان پر ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مولانا خیر بہوردی کے سانحۂ انتقال پر اظہار غم و ملال کیا گیا۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ دور جدید کی نسل مولانا خیر بہوردی کے ادب، اخلاق، تہذیب، کلچر اور علم مجلس سے کافی متاثر ہوئی ہے۔ مولانا مرحوم ایک انجمن ساز اور ادب نواز انسان تھے۔ ان کے انتقال سے علم و ادب اور تہذیب و تمدن کی شمع گل ہو گئی۔

• مقبول حسین

▲



جامعاتی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کے اردو کالجس کے قیام کا مطالبہ

حیدرآباد: ۔ جامعاتی سطح پر تلگو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم کو بھی رائج اور اردو ذریعۂ تعلیم کے کالجس قائم کرنے کا مطالبہ مختلف تنظیموں کے طلبہ قائدین نے ایک مشترکہ بیان میں کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ حکومت اور یونیورسٹی اپنے زیر انتظام کالج میں، اردو ذریعۂ تعلیم کا بھی انتظام کرے اور ہیومانیٹیز، کامرس اور سائنس کے تمام شعبوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کی بھی متوازی جماعتیں قائم کی جائیں۔ مطالبہ کیا گیا ہے کہ تلنگانہ کی حد تک ہر ضلع کے مستقر پر اردو کی متوازی جماعتیں قائم کی جائیں اور علاقہ آندھرا میں جہاں اردو والوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہو وہاں پر بھی اردو کی متوازی جماعتیں قائم کی جائیں۔ ● سیاست حیدرآباد

تلنگانہ میں جامعاتی سطح پر اردو ذریعہ تعلیم کا مطالبہ

سنگا ریڈی ضلع میدک کے (۳۰) معزز شہریوں نے جن میں انجمن ترقی اردو کے عہدہ دار ممتاز ایڈوکیٹس، اراکین بلدیہ اور کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی شامل ہیں ایک مشترکہ بیان میں جامعاتی تلگو کے ساتھ ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کے بھی انتظامات کا مطالبہ کیا ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ ریاست کی تین جامعات کے وائس چانسلروں کی حالیہ کانفرنس میں تلگو کو جامعاتی سطح پر رائج کرنے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ درست ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ آندھرا پردیش میں تلگو کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے ڈگری کلاسوں کے لئے تلگو کے ساتھ ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کا بھی انتظام ناگزیر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جن طلبہ اور طالبات نے اردو ذریعہ تعلیم سے انٹرمیڈیٹ میں کامیابی حاصل کی ہو ان کے لئے ڈگری کلاسس کے لئے بھی اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام کیا جائے بالخصوص اضلاع تلنگانہ میں جہاں اردو کو علاقائی زبان کا درجہ دیا گیا ہے فی الفور اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام از حد ضروری ہے۔

● سیاست حیدرآباد

اردو طلبہ کے لئے ڈگری کالجس کے قیام کا تیقن

حیدرآباد: ۔ وزیر تعلیم جناب پی وی نرسمہا راؤ نے اسمبلی میں وقفہ سوالات کے فوری بعد جناب صلاح الدین اویسی ایم ایل اے (مجلس) کی توجہ دہانی پر کہا کہ انٹرمیڈیٹ کے نتائج نکلنے کے بعد صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے اردو طلبہ کے لئے ڈگری کلاسس بھی قائم کی جائیں گی۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت اردو طلبہ کے مستقبل کے تعلق سے پوری پوری ہمدردی اور دلچسپی رکھتی ہے۔

● سیاست حیدرآباد

(باقی صفحہ ۱۲ سے آگے)

کے اپنے علمی طریق کار اور طرز فکر کے لحاظ سے اس مخصوص علم کا ایک حصہ مانی جا سکتی ہے، مگر جب تک وہ ادب اور ادب پارے کے تخلیقی پہلوؤں اور فنی گوشوں کو ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے اجاگر نہ کرے ادبی تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتی۔

تنقید کی اسی مایوس کن صورت حال کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے اصول اور نظریات تو مغرب سے سیکھ لئے، مگر ان کو استعمال کرنا اور ادبی تنقید کو ان کی بنیاد پر کھڑا کرنا ہم نے نہیں سیکھا۔ مغرب کے تنقیدی مکاتیب خیال اور اصطلاحات مغرب کے کلچر، آرٹ اور ادب سے ماخوذ ہیں۔ کسی تنقیدی اصول یا نظریے کی بنیاد پر ادب تخلیق نہیں ہوتا بلکہ ادب کی بنیاد پر تنقیدی اصول اور نظریے بنتے ہیں۔ ارسطو کی بوطیقا سے لے کر جدید ترین مغربی تنقیدی کاوشوں تک تمام اصول ادب پاروں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ہمارے یہاں تنقید اور تخلیق میں بڑا فاصلہ رہا ہے۔ حالی اور شبلی کے بعد سے اب تک ادب کے تغیر پذیر میلانات نئی نئی اصناف کی نشو و نما اور فن (زبان) کے بدلتے ہوئے تصورات کی روشنی میں ہم نے اپنی تنقید کے اصول مدون کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے یہاں عملی تنقید نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہماری تنقید کا بڑا حصہ نظریاتی ہے۔ اور نظریاتی تنقید بھی تنقید کا ادبی طریقۂ کار نہیں بنتی بلکہ چند تصورات و نظریات کا اعادہ بن جاتی ہے۔ مغربی آرٹ کے مختلف مکاتیب اور ان کی اصطلاحات کا اطلاق تو ہمارے یہاں اور بھی مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔

تنقید کو مستحکم بنیاد پر کھڑا کرنے اور اس کے مختلف طریقہ ہائے کار کو برتنے اور پروان چڑھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تنقید کو تخلیق کا عرفان حاصل ہو۔ اسی سرچشمے سے نور و حرارت اخذ کی جا سکتی ہے۔ ہمیں اپنے کلچر اور اپنی ادبی روایات کی روشنی میں مغربی مکاتیب تنقید کے اصولوں کو ڈھالنا اور کبھی کبھی بدلنا بھی پڑے گا۔ محض مختلف مرعوب کن اصطلاحات کے استعمال سے ہماری تنقید معنی خیز نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے وہ دوری جو اب تک تنقید اور تخلیق میں رہی ہے وہ دور کرنی ہوگی اور اصطلاحات کے استعمال میں محتاط ہونا پڑے گا۔ اصطلاحات کی بنیاد پر تنقید کی عمارت کھڑی نہیں ہوتی بلکہ تنقید، ادب اصطلاحات کو جنم دیتا اور معنی عطا کرتا ہے۔

وحید اختر

میرا صفحہ

ہم اپنی زبان کی تنقید میں بہت سی اصطلاحات سے دوچار ہوتے ہیں: جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، عملی تنقید، نفسیاتی تنقید، عمرانیاتی تنقید، مارکسی تنقید۔ انہی کے ساتھ اور بھی اصطلاحات ہیں: حقیقت نگاری، رومانیت، خارجیت، داخلیت وغیرہ۔ اگر ان اصطلاحات کے استعمال اور محلِ استعمال پر غور کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اب تک ان میں سے کسی کے نہ تو معنی متعین ہوئے ہیں اور نہ مختلف مکاتیبِ تنقید کو صحیح معنی میں ہمارے یہاں برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی تنقید میں ان اصطلاحات کے متعین معنی بھی ہیں اور ان تمام طریقہ ہائے تنقید کو برتا بھی گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہماری جتنی بھی واقفیت ہے وہ بڑی حد تک انگریزی کے توسط سے ہے۔ اگر ہم اپنی زبان کے تنقیدی ادب میں ان کا سراغ لگانا چاہیں تو نتیجہ زیادہ امید افزا نہیں نکلے گا۔

ہمارے تذکروں میں تنقید کی جو شکل ملتی ہے، اسے ایک حد تک تاثراتی کہا جا سکتا ہے یا پھر بیشتر قدما نے فن، زبان، بیان اور عروض وغیرہ کے مسائل سے بحث کی ہے۔ کسی ادب پارے کو من حیث الکل سمجھنے اور اس کی قدر کا تعین کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاثراتی تنقید ایک حد تک جمالیاتی تنقید کے قریب آجاتی ہے مگر یہ تعلق بھی بہت دور از کار ہے۔ صحیح معنوں میں جمالیاتی تنقید کا ہمارے ہاں کوئی طریقۂ کار فروغ نہیں پا سکا اس لئے کہ ہیئت (FORM) کے مطالعے کو الگ سے بہت کم اہمیت دی گئی ہے۔ ادب کی جمالیاتی قدروں میں محض حسن اور حسن شناسی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اسی طرح نفسیاتی تنقید کے ضمن میں چند کوششیں تحلیلِ نفسی اور ادب پر اس کے اطلاق کے سلسلے میں ہوئی ہیں۔ ادھر غالب کے مطالعے میں بھی نفسیاتی طریقِ کار کو برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میراجی نے نظموں کے تجزیے میں بھی اس سے تھوڑا سا کام لیا ہے۔ اگر کوئی ایسا ناقد جسے ہم اس طریقۂ کار سے خصوصی طور پر منسوب کر سکیں، نہیں ملے گا۔ نفسیاتی تجزیے کی کوششیں اب تک تجربے کے حدود سے آگے نہیں بڑھیں۔ عمرانیاتی تنقید کی بنیاد عمرانیات (SOCIOLOGY) کے طریقِ تحقیق پر مبنی ہونا چاہئے لیکن ہمارے یہاں یا تو بہت ہی سطحی انداز میں معاشرتی اور سیاسی پس منظر اور اس کی غیر ضروری تفصیلات کو اس کا نعم البدل سمجھ لیا گیا ہے (عام طور سے تنقیدی مضامین اور تحقیقی مقالوں میں یہی کیا جاتا ہے) یا پھر مارکسی تنقید کو عمرانیاتی تنقید سمجھ لیا گیا۔ خود مارکسی تنقید کا بھی حال یہ ہے کہ سطحی طور پر مارکس اور لینن، اینگلز اور استالن کے حوالوں اور مارکسزم کے سیاسی نظریے کی تبلیغ اس تنقید کے مترادف مانی جاتی ہے۔ حالانکہ مارکسی انداز نظر سے ادب اور فن کی تنقید کہیں زیادہ دقتِ نظر چاہتی ہے۔ اس کا تعلق مارکس کے سیاسی نظریے سے اتنا نہیں جتنا مارکس کے طریقۂ کار سے ہے۔ حقیقت نگاری کو اسی مکتبِ فکر کا دُم چھلا مانا جاتا ہے۔ آرٹ اور مغربی ادب میں حقیقت نگاری کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ جس میلان کو ہم رومانیت (یا رومانویت) کہتے ہیں اس کے آثار سطحی رومانی شاعری میں ڈھونڈے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں رومانیت کا نہ ادب میں کوئی مستقل میلان رہا ہے نہ یہ ویسی تحریک ہے جیسی مغرب میں ملتی ہے۔ داخلیت اور خارجیت کو بھی ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ کبھی اچھے اور کبھی برے معنوں میں ہی محدود طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً داخلیت ترقی پسند دورِ تنقید میں ادب کا عیب تھی اور جدیدیت کے دور میں ادب و شعر کا طرۂ امتیاز بن گئی ہے۔ ہمارے اکثر ناقدین ان اصطلاحات کو ان کے مفروضہ (اور اکثر غلط) معنوں میں برتتے چلے آئے ہیں۔ اسلوبیاتی اور لسانیاتی تجزیے کے جدید تر میلان میں بھی یہی ہو رہا ہے کہ ہم ان مکاتیبِ تنقید کو طریقۂ کار کے بجائے مقصود بالذات سمجھنے کی طرف مائل ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر اردو کے تنقیدی سرمایے کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا شاید بہت نامناسب نہ ہو کہ اب تک صحیح معنوں میں ہمارے یہاں تنقید کا کوئی واضح تصور بنا ہی نہیں، اسی لئے تنقید کا کوئی مکتبِ خیال بھی پوری طرح پروان نہیں چڑھ سکا۔

ادبی تنقید ادب کی ایک شاخ ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ فلسفے، نفسیات، عمرانیات یا کسی اور علم کا عالم اپنے نقطۂ نظر سے ادب پر کچھ لکھتا ہے تو ہم اسے ادبی تنقید میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس کی دوسری اور زیادہ سطحی صورت یہ ہے کہ کچھ ناقدین غیر ضروری طور پر فلسفہ، تصوف، مذہب، اساطیر، سائنس اور عمرانی علوم، نفسیات اور تحلیلِ نفسی کے نظریات سے اپنے مضامین اور کتابوں کو بے جا ضخیم کر لیتے ہیں مگر اصل موضوعِ بحث سے ان کا کوئی جائز تعلق قائم نہیں کر سکتے۔ تنقید مختلف علوم سے مدد لے سکتی ہے، مگر ان کی بے محل جگالی نہیں۔ اسی طرح فلسفے یا عمرانیات یا نفسیات کے عالم کی تحریر ادب پر بھی اس

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید افضال حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوا کر دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

REGD-NO-L-922 فون نمبر ۲۹ R-NO. 2186/57